

شازیہ عندلیب*
ڈاکٹر صدف نقوی***

زاہدہ حنا کی افسانہ نگاری میں سیاسی و سماجی حقیقت نگاری

Social and Political Reality in the Fiction of Zahida Hina

By Shazia Andleeb, PhD Scholar, Department of Urdu, Govt. College Women University.

Dr. Sadaf Naqvi, Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. College Women University.

ABSTRACT

Zahida Hina is a Pakistani fiction writer of 21st century who possesses deep social and political knowledge. Her fiction writing are based on social and political realism. She got popularity on producing Afsana "Zatoon key Shakh" which is a representative of political and social problems and strength the political knowledge of the writer by amalgamation of past present situation. On the critical study of Zahida Hina's fiction, it reveals that she is female interpreter of the common "Ghanga Jamni" culture of Indo Pakistan history largely. This is the reason that she is a vibrant transformer of history of the era. She narrates that political and cultural situation of contemporary spam in a marvelous manner.

Keywords: Fiction, Social, Political, Realism, History, Amalgamation

زاہدہ حنا اکیسویں صدی کی پاکستانی اردو افسانہ نگاروں میں سماجی و سیاسی حوالے سے گہرے عصری شعور کی حامل افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے سماجی و سیاسی حقیقت نگاری کے عکاس ہوتے ہیں۔ ان کی ابتدائی شہرت ان

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد *
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد ***

کے افسانے ”زیتون کی شاخ“ کی وجہ سے ہوئی جو سیاسی و سماجی مسائل کا نمائندہ افسانہ ہے اور افسانہ نگار کے سیاسی شعور کی نمائندگی کرتا ہے۔ ماضی اور تاریخ کے ساتھ ان کی گہری جڑت نے ان کے افسانوں میں سیاسی و عصری شعور کو مزید پختہ بنا دیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انوار احمد بجا طور پر ان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

زاہدہ حنا ایک لبرل اور ترقی پسند تصویرِ حیات رکھتی ہیں وہ تاریخ اور ماضی سے لگاؤ رکھتی ہیں مگر اس حد تک کہ آشوبِ عصر کی معنویت ہاتھ آ سکے۔ جل ہے سارا جال بے حد جرأت مند انہ افسانہ ہے، ایسی صورت حال میں جب پاکستان میں بیشتر گھروں میں یہ عقیدہ بن چلا تھا کہ عرب ان کے رازق اور پالن ہار ہیں اور ان کے التفات کو دیر پا بنانے کی ایک صورت مرغوباتِ نسوانی کی پاکستان سے فراہمی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زاہدہ حنا باشعور قلم کاروں کی طرح ہمارے معاشرے میں ہونے والی بہت سی نا انصافیوں کے بارے میں نہ صرف معلومات رکھتی ہیں بلکہ آواز بلند ان کا اظہار بھی مصلحت سوز ہوتا ہے مگر اس طرح افسانوی فضا مجروح بھی ہوتی ہے۔^(۱)

زاہدہ حنا کے افسانے سیاسی و سماجی حالات کی نمائندگی سپاٹ بیانیے کی صورت میں کرتے ہیں جن میں علامتیت کے بجائے براہ راست سیدھا بیانیہ تشکیل پایا ہے۔ زاہدہ حنا کے افسانوں میں پاکستانی سیاست کو بڑے لطیف انداز میں طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ کراچی میں مہاجر سندھی اختلافات اور مقامی لوگوں اور اردو بولنے والوں میں اختلافات کو ہوادے کر سیاست کرنے والی سیاسی پارٹیوں نے کراچی کے امن و امان کو داؤ پر لگایا اور وہاں اکیسویں صدی میں مشرف دور میں پٹھانوں کی مداخلت سے مزید حالات خراب ہو گئے۔ ایم کیو ایم کی شہمہ پر غنڈہ گردی عروج پر پہنچی اور کراچی میں بھتہ لینے والا مافیا بہت زیادہ فعال ہوا جس کی وجہ سے لوگوں کی جان و مال محفوظ نہ رہا۔ بالآخر ریجنل گورنمنٹ کو اسٹریٹ آپریشن کا کام سونپا گیا۔ ان کا افسانہ ”زیتون کی شاخ“ اس ساری صورتحال کی نمائندگی کرتا ہے۔ ”زیتون کی شاخ“ میں زاہدہ حنا نے امریکہ کے سماجی و سیاسی حالات کے ساتھ پاکستان کے سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی بھی کی ہے۔ بالخصوص کراچی کے دگرگوں حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے مہاجر اور مقامی لوگوں میں فسادات اور کشیدگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانے کا واحد متکلم کردار (First Person Narrator) اپنی زندگی کے روزمرہ کے معمولات کو بیان کرتا ہے اور پھر جبری طور پر فوج میں بھرتی شدہ ویتنام کے جنگی محاذ پر بھیجے جانے والے ایک کردار ایڈگر کوہن سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ بعد ازاں افسانہ

ایڈگر کوہن کی محرومیوں اور نارسائیوں کے ساتھ ساتھ اس کی دکھ بھری داستان لیے آگے بڑھتا ہے۔ افسانے کا آغاز رم جھم کے ایک خوبصورت منظر کے بیان سے ہوتا ہے:

بوندیں چپا کی خوشبو پر، کامنی کی رنگت پر اور مٹی کی پیاس پر برس رہی ہے۔ کمرے کے اندر گیتوں کے بول ہیں۔ مینہ کی بوندیں اور گیتوں کے بول کھرند جیسے ہوئے زخموں پر برستے ہیں تو زخم جیسے کھل اٹھتے ہیں بوندیں برس رہی ہیں اور زخموں کے گلاب کھلے ہوئے ہیں۔ ان گلابوں کی شاخوں پر ابھرے ہوئے نوکیلے کانٹے یاد کی انگلیوں میں چبھتے ہیں تو نہ کچھ سوچنے کو جی چاہتا ہے اور نہ کرنے کو۔ میں الجھ کر میز پر رکھا ہوا ”پاکستانی ادب“ کا ”امریکی نمبر“ اٹھاتی ہوں اور اس کی ورق گردانی کرنے لگتی ہوں، میں صفحات پر پلٹتی ہوں۔ پھر میری نگاہیں ایک صفحے پر رک جاتی ہیں۔^(۲)

افسانے کا آغاز خوبصورت منظر نگاری سے ہوتا ہے اور ارد گرد کے مسحور کن ماحول کی جزئیات کو افسانہ نگار منظر میں پوری طرح سمیٹتے ہوئے آگے بڑھتی ہیں اور افسانے میں ایک اور مرکزی کردار ایڈگر کوہن کے متعارف ہوتے ہی امریکیوں کے سماجی اور سیاسی حالات کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ امریکیوں میں سے بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ملک و قوم کے لیے امریکی نوجوان شہریوں کی جبری بھرتی کا قانون نظریہ ضرورت کے تحت بالکل درست ہے اور ریاست کے اگر وجود کو خطرہ لاحق ہو تو فوج میں نہ صرف جبری طور پر بھرتی کی جاسکتی ہے بلکہ انھیں محاذ جنگ پر بھی بھیجا جاسکتا ہے۔ جو امریکی جوان جبری بھرتی کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں انھیں عدالتوں میں ٹرائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یوں ان لوگوں کو معاشرہ بھی بُری نگاہ سے دیکھتا ہے اور انھیں بقیہ زندگی میں کم ہمت اور بزدل ہونے کے طعنے سہنے پڑتے ہیں۔

زاہدہ حنا نے اس افسانے میں ایڈگر کوہن کے کردار کے ذریعے سے ان تمام حالات کی عکاسی کی ہے۔ دوسری جانب ایڈگر کوہن ایسا نوجوان ہے جو جنگ سے انتہائی نفرت کرتا ہے اور اسے ڈرافٹنگ کے شعبے سے پیار ہے۔ اس کا والد ویت نام کی جنگ میں گولیوں کا نشانہ بنا جس کی وجہ سے وہ جنگ سے شدید نفرت کرتا ہے۔ جنگ نے اس سے اس کا والد چھین کر بے یار و مددگار کر دیا۔ اسی وجہ سے وہ جنگ کی ہولناکیوں سے خوف زدہ ہے۔ تیسرا کردار ایڈگر کوہن کی ماں کا ہے جس کی خط و کتابت افسانہ نگار کے ساتھ ہوتی ہے اور امریکہ عراق جنگ کے تناظر میں معاصر دنیا کے سیاسی و سماجی حالات سے پردہ اٹھایا جاتا ہے۔ اسی طرح ایڈگر کوہن اور افسانہ نگار

کے درمیان ہونے والی گفتگو سے بھی پاکستان کی سیاسی و سماجی صورت حال کی عکاسی ہوتی ہے۔ جب ایڈگر کوہن اور افسانہ نگار کے درمیان برصغیر کی تاریخ کے حوالے سے بات ہوتی ہے تو بہت سے تاریخی و سیاسی مسائل برسبیل تذکرہ سراٹھاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں:

”تمھاری تاریخ؟ یعنی پاکستان کی تاریخ؟ میرا مطلب ہے کہ برصغیر ہند و پاک کی تاریخ۔“ میں نے کہا، ”مجھے معلوم تھا کہ اس کا اگلا جملہ کیا ہوگا ہر امریکی اس موضوع پر بات کرتے ہوئے یہی کہتا تھا اور امریکیوں پر ہی کیا منحصر تھا، اس بارے میں تمام غیر ملکی ایک طرح سے سوچتے تھے۔ ہاں برصغیر کی تاریخ ہمارے نصاب میں سے تھی، لیکن واقعی تم لوگوں کا جواب نہیں ہے۔ پاکستان میں رہتے ہو اور پورے برصغیر کی تاریخ کو اپنی تاریخ کہتے ہو۔ لاکھوں انسانوں کے خون سے تم نے اپنے ملک کی سرحدیں کھینچی ہیں۔ تمھارا سرحد پار کی تاریخ سے بھلا کیا تعلق؟“ وہ خوش دلی سے ہنسا۔ ”مجھے معلوم ہے تم سب ہمارا مذاق اڑاتے ہو اور تم بھی اپنی جگہ صحیح کہتے ہو۔ ہم نے ایک ملک کو تقسیم تو کر دیا لیکن اپنا ماضی کاٹ کر پھینک نہ سکے ہماری کتنی ہی چیزیں وہیں رہ گئیں کیوں کہ وہ دھرتی کا حصہ تھیں۔“ (۳)

زاہدہ حنا کے اس افسانے میں ایک کاٹ دار طنز ہے جو اگرچہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے لیکن سیاسی اور سماجی نوعیت کا ضرور ہے۔ اس میں برصغیر کی تقسیم کے مابعد کا تناظر دیکھنے کو ملتا ہے جس پر منظر منظر لہو کے چھینٹے بھی ہیں اور حسرت و یاس کی آہیں بھی بکھری ہوئی ہیں۔ سیاسی انتشار کے جس دور سے پاکستان تیسرے مارشل لا کے اختتام کے بعد گزرا اور پھر پرویز مشرف کے مارشل لا میں کراچی جس سیاسی و سماجی عفریت سے گزرا وہ خونی واقعات کی رنگین داستان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ افسانہ نگار نے حال کے سیاسی و سماجی احوال کو ماضی کی تاریخ سے جوڑا ہے۔

زاہدہ حنا کا افسانوی کینوس بہت وسیع ہے۔ انھوں نے تاریخ سے اتنا گہرا رشتہ جوڑا ہے کہ آج کے سیاسی و سماجی حالات کو بھی تاریخ کے تناظر میں ہی دیکھتی ہیں۔ آرٹ، موسیقی، فلسفہ اور معاشرتی علوم سے ان کی گہری وابستگی نے ان کو ایک نیا زاویہ نگاہ بخشا ہے اور ان کے افسانوں میں سیاسی اور سماجی شعور کے ساتھ تاریخی شعور کی لہر پیدا ہوئی ہے۔ وہ انتہائی بے باک اور نڈر قلم کار کی صورت میں تعصب سے بالاتر ہو کر انسانی مسائل پر میں روشنی ڈالنے میں کامیاب ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح زاہدہ حنا کے افسانوں میں عصر حاضر کی عورت کا کردار

بھی بڑا جاندار ہے اور وہ کسی جبر کو سہنے سے مکمل طور پر انکار کرنے کی جرأت رکھتی ہے۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ ”رقصِ بسمل“ اسی جرأت مندی کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اس میں تیرہ طویل افسانے شامل ہیں۔ ”آنکھوں کو رکھ کے طاق پے دیکھا کرے کوئی“ اس مجموعے میں شامل ایک ایسا ہی افسانہ ہے۔

اس افسانے میں سویت یونین کے مابعد کا تناظر پیش کیا گیا ہے اور اسی تناظر میں افغانستان پاکستان روس وسط ایشیا کے سماجی حالات کی عکاسی کی گئی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار بیلے ڈانسر ہے جس کے دل میں سوراخ ہے اور اسے بچہ پیدا کرنے سے ڈاکٹروں نے منع کیا ہے۔ لیکن وہ ایک پاکستانی سے شادی کر کے اس کے سسرال میں رہتی ہے اور بعد ازاں بچے کو جنم دیتی ہے۔ اسی دوران میں وہ مرجاتی ہے۔ یہاں پر عورت کے اندر ماں بننے کی خواہش کی لامحدودیت کو بیان کیا گیا ہے جو کسی بھی حقیقت کی پرواہ کیے بغیر تخلیق کو حقیقت کا روپ دینا چاہتی ہے۔ اسی طرح ایک اور افسانہ ”پانیوں پر بہتی پناہ“ بنگلہ دیش کی ایک باغ قلمکار کی کہانی ہے جس کی تحریروں کی وجہ سے مذہبی طبقہ سخت پاپا ہے۔ اور اس کے زندہ یا مردہ پکڑنے پر انعام رکھا گیا ہے۔ اس جرنلسٹ کو کشتی بان بچاتا ہے جس کی اپنی بیٹی سماج کی بلی چڑھ چکی ہوتی ہے۔ وہ اسے اپنی کشتی میں چھپا کر لوگوں کی نظروں سے بچا لیتا ہے۔ اس طرح اس کے دوست احباب اس کو وہاں سے نکال کر مغربی ممالک بھیجنے کا ارادہ کرتے ہیں جہاں اسے سیاسی طور پر پناہ مل سکتی ہے۔ لیکن وہ اپنے ملک سے باہر جانے سے مکمل طور پر انکار کر دیتی ہے۔ اس طرح یہ افسانہ پڑھتے ہوئے بنگلہ دیشی رائٹر تسلیمہ نسرین ذہن میں آتی ہیں جن کے ساتھ حسینہ واجد کی حکومت نے مظالم کو چھپانے کے لیے کچھ اسی قسم کا سلوک کیا تھا۔ اس طرح اس افسانے میں زاہدہ حنا نے اپنے عصر کے آشوب کو سیاسی اور سماجی حوالے سے بیان کیا ہے۔

اسی طرح کا ایک اور افسانہ ”معدوم ابن معدوم“ ہے جس میں ایک محب الوطن کردار کرنل معصوم حسین ہے جس نے ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا دی تھی۔ لیکن کراچی اس کے پوتے جعفر کو ہندوستانی سراغ رساں ایجنسی ”را“ کا مخبر ہونے کی وجہ سے پکڑ لیا جاتا ہے۔ وہ لاپتا ہو جاتا ہے اور بعد ازاں مار دیا جاتا ہے۔ کرنل معصوم حسین کے مہاجر پوتے پر پاکستان کے خلاف مخبری اور جاسوسی کرنے کا الزام عائد کرتے ہوئے مارا جاتا ہے اور یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت بھی مہیا نہیں ہیں اور اسے محض شک کی بنا پر قتل کیا جاتا ہے۔ کرنل معصوم حسین کے پوتوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا جاتا ہے اور ان میں سے ایک کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ اس طرح کرنل معصوم حسین کے پوتوں علی اکبر اور جعفر جیسے کھرے اور سچے محب وطن پر شک کی بنا پر ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں اور گزشتہ ادوار میں پاکستان کے لیے ان کے خاندان کی دی جانے

والی تمام قربانیوں کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ افسانہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اکیسویں صدی کے بہت سارے جاسوسی کرنے والے لوگوں کی کہانیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور بتلاتا ہے کہ کس طرح سے مخبر ایجنسیاں معصوم لوگوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر ان کی حب الوطنی پر سوالیہ نشان لگا دیتی ہیں اور ان کی گزشتہ تمام قربانیوں کو بھلا دیا جاتا ہے۔

اس طرح پاکستان میں مہاجرین کے ان مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے کہا نہیں پاکستان کی خبر ایجنسیاں کس طرح سے شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ان پر ہندوستانی جاسوس ہونے کا گمان کرتی ہیں۔ ان کی حب الوطنی اور قومیت پر ہر لمحہ سوال کھڑے کیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ان کو تفتیش میں بھی شامل کیا جاتا ہے اور ان کی عزت داؤ پر لگائی جاتی ہے۔ انھیں اپنے پاکستانی ہونے کا ثبوت ہر بار دینا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر علی اپنے موروثی جاہ و جلال کو دیکھتے ہوئے اپنے دادا سے کہتا ہے:

”اس لیے دادا میاں کہ آپ چھ سو برس سے اس زمین پر ہیں تو آپ اس برگد کی طرح ہوئے جو زمین سے جتنا اوپر ہے، اس سے کہیں زیادہ گہرائی میں اور کہیں زیادہ دور تک پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اور دادی بیگم کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ آپ یہاں گڑے ہوئے ہیں۔ ہم سب شیشے میں سانس لیتے ہوئے منی پلانٹ کی طرح ہیں جس کا زمین سے کوئی ناٹھ کوئی رشتہ نہیں۔ بُری بات ہے علی اکبر، ایسی باتیں مت کرو۔ پاکستان تمھارا ملک ہے۔ کراچی میں تمھارا گھر ہے۔ گھر کے لیے منہ سے بدفال نہیں نکالو۔“ سپر آر آنے سہم کر کہا تھا۔ کراچی سے اب خون میں بھیگی ہوئی خبریں آتی ہیں۔ کس شہر اور کس گھر کی بات کرتی ہیں، دادی بیگم! وہ غزل شاید آپ نے بھی سنی ہو۔ برق زمانہ دور تھی لیکن مشعل خانہ دور نہ تھی۔ یہ سوچے بھی نہیں کہ رہ جانے والے راگھو جانیس گے۔ علی اکبر دلی سے چند دنوں کے لیے کراچی چلا گیا۔ پھر لندن واپس جانا تھا۔ وہ چلا گیا تھا اور دادا اور دادی کے دلوں میں وہم اور وسوسے کے بھنور جال چھوڑ گیا تھا۔^(۴)

اس افسانے میں کراچی کے دگرگوں حالات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اسی طرح پاکستان کے مہاجرین کی یاسیت اور حرماں نصیبی کو بیان کیا گیا ہے۔ وطنیت پرستی اور قومیت پرستی کہ بڑے بڑے ٹینڈر یہاں کے جرنیلوں کو ملتے رہے۔ جن لوگوں نے پاکستان کے لیے لاکھوں جانیں قربان کی تھیں۔ ان کی آئندہ نسلوں کو نہ صرف مہاجر

ہونے کی بنا پر طعنے دیے جاتے رہے بلکہ ان کی وطن پرستی اور قومیت پرستی پر بھی سوال قائم کیے گئے اور ان کو مناسب حقوق دینے میں پس و پیش سے کام لیا گیا۔ کراچی میں مہاجر قومی موومنٹ اسی تناظر میں مہاجرین کے لیے آواز اٹھانے والی جماعت کے طور پر میں معرض وجود میں آئی۔ جس نے مہاجرین کی یاسیت و حرماں نصیبی کو کسی طرح سے کم کرنے کی کوشش کی اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے آواز اٹھائی۔

یہ الگ بات ہے کہ ایم کیو ایم جیسی ایک سیاسی اور سماجی نوعیت کی تحریک نے عسکریت پسندی اور شدت پسندی کی راہ اختیار کرتے ہوئے کراچی میں تصادم اور ہٹ دھرمی کی سیاست کو رواج دیا۔ اس افسانے کے ذریعے سے زاہدہ حنا نے ۲۰۰۲ء کے بعد کے کراچی کے مخدوش حالات کی عکاسی کی ہے۔ جب کراچی میں کلاشکوف کلچر عام تھا۔ بھتہ خوری عروج پر تھی اور ٹارگٹ گلنگ سے کوئی بھی محفوظ نہیں تھا۔ نپٹنٹ کراچی کو رینجرز کے حوالے کیا گیا اور پاکستان کی ممبر ایجنسیوں نے دہشت گردی کے پیش نظر محض شکوک و شبہات کی بنا پر بہت سارے مہاجرین کو اٹھا کر روپوش کر دیا۔ ان لاپتا ہو جانے والے افراد میں بہت سے ایسے بھی تھے جن کے آباؤ اجداد نے قیام پاکستان میں بڑی بڑی قربانیاں پیش کی تھیں اور بڑی دعاؤں اور منتوں سے انھوں نے اس سر زمین کو حاصل کیا تھا۔

علی اکبر اور اس کے دادا کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے مہاجرین کس طرح کرب اور اذیت میں مبتلا ہیں۔ اس کے برعکس ان کے دادا، جن کو علی اکبر ایک برگد کے درخت سے تشبیہ دیتا ہے اور اس کی بنیادوں کو انتہائی مستحکم قرار دیتا ہے۔ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کو پاکستان کے برعکس ان کی قومیت پرستی اور وطنیت پرستی پر شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں پاکستان میں پھیلنے والی دہشت گردی کی لہر کے تناظر میں یہ افسانہ کراچی کے سیاسی اور سماجی حالات کی خوبصورت عکاسی کرتا ہے۔

اسی طرح زاہدہ حنا کا ایک اور افسانہ ”منزل ہے کہاں تیری“ پاکستان اور ہندوستان کے معاصر سیاسی اور سماجی حالات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں اکیسویں صدی کے آغاز میں پیدا ہونے والے بابر مسجد کے تنازعے کے کیا اثرات دونوں ملکوں کی اقلیتوں پر مرتب ہوئے ہیں؟ ہندو مسلم فسادات کے حوالے سے جب بھی کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس کے اثرات دونوں ملکوں کی اقلیتوں پر واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ پاکستان میں ہندو اقلیت میں ہیں اور ہندوستان میں مسلمان ہندو کی اکثریت کے مقابلے میں دوسرے نمبر کی اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے کوئی بھی واقعہ جو مسلمانوں کے

خلاف ہندوستان میں رونما ہوتا ہے، اس کا براہ راست اثر پاکستان کی اقلیتوں پر بھی ہوتا ہے۔ بالخصوص ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی زندگیاں متاثر ہوتی ہیں۔

افسانہ ”منزل ہے کہاں تیری“ میں مدن کی معشوق عالیہ امریکا سے اوشا کی شادی کے لیے تحفے لے کر کراچی پہنچتی ہے اور کراچی میں آنے کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ایک انتہائی ہولناک واقعہ رونما ہوا ہے جو کہ بابری مسجد کے انہدام سے متعلق ہے۔ مقامی ہندوؤں نے بابری مسجد کو متنازع بنا کر مسجد کو منہدم کرنے اور وہاں پر مندر تعمیر کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہندو مسلم فسادات کھڑے ہو گئے ہیں۔ ہندوستان میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد مسلمانوں کا رد عمل کراچی کے مقامی ہندوؤں پر حملے کی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ غریب اوشا کا باپ مارا گیا ہے۔ اوشا نے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی ہے۔ اوشا اور اس کے باپ کا ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاتھوں منہدم ہونے والی بابری مسجد سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود ہندو ہونے کی بنا پر انھیں سزا بھگتنا پڑی جو کہ ناکردہ گناہوں کی سزا ہے۔ اس طرح اس افسانے میں بڑے واضح طور پر زاہدہ حنا نے کراچی کے سیاسی اور سماجی حالات کو اور مخدوش Law and Order کی

صورتحال کو پیش کیا ہے۔ ایک منظر اس افسانے سے اسی تناظر میں ملاحظہ کیا جانا قرین انصاف ہوگا:

گھر آنے کے بعد کی سہ پہر، اس نے کھلی ہوئی کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔ جہاں دو پہر کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ اور ہر طرف خزاں تھی۔ ذات سے باہر اور ذات کے اندر پت جھڑ کا موسم۔ ان کھلی ہوئی کھڑکیوں سے باہر اوشا کہیں نہیں تھی، اوشا کے پتا کہیں نہیں تھے... انسان حیوانوں کا نوالہ تھے... اب سے پہلے وہ نہیں جانتی تھی کہ اجدھیا میں گرائی جانے والی مسجد کی قیمت اس کے گھر میں رہنے والے اوشا کے پتانے بھی چکا ہے۔ وہ تو کچھ نہیں جانتی تھی۔ ان کا چہرہ اس کی لبریز نگاہوں میں تیرا اور درد اس کے سینے میں لہریں لینے لگا۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ انسان کو امان کہیں نہیں ملتی تھی... ایک آواز کی بازگشت سے زمین و آسمان بھرے ہوئے تھے۔ اے لوگو! خدا کے گھروں کی بے حرمتی ہوئی۔ مسجد گرائی جا رہی تھی۔ مندر جلانے جا رہے تھے۔ گرجا گھروں پر بلندوزر چل رہے تھے۔ کچھ مسجدیں تھیں جن کی پیشانیوں سے کلمہ کھرچا جا رہا تھا۔ اے لوگو! خدا کے گھروں کی بے حرمتی ہوئی، بے حرمتی ہوئی۔^(۵)

اس افسانے میں ہندو مسلم کمیونٹی میں جہاں بہت سی نفرتوں کے پھیلانے جانے کی بات کی گئی ہے وہاں پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ازلی رقابت اور دشمنی، دونوں ملکوں کے عوام کی نفسیات اور ان کے سماجی حالات کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ فرقہ واریت، عدم برداشت، تعصب، نفرت، مذہبی عدم رواداری، لسانی تنازعات، نسلی امتیازات اور دیگر قسم کے اختلافات کی بنیادوں پر سندھ کے عوام کو انتشار اور شدت پسندی کی طرف بیرونی قوتیں اور اندرونی قوتیں دھکیل رہی تھیں۔ یہ چوتھے مارشل لا کے دنوں کی بات ہے، جب کراچی میں ایک بار کرفیو بھی لگانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ زاہدہ حنا نے ہندوستان اور پاکستان کے سیاسی اور سماجی حالات کا چوں کہ براہ راست مشاہدہ کیا تھا اسی لیے انھیں اس کہانی میں سمونا مشکل نہیں لگا اور انھوں نے بڑی فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ دونوں ملکوں کے سیاسی و سماجی حالات کو موضوع بنایا ہے۔ اس مجموعے میں شامل ان کا ایک اور افسانہ ”رقص مقابر“ ہے جس میں افغانستان کی تباہی و بربادی کو موضوع بنایا کر وہاں کے عصری آشوب کو پیش کیا گیا ہے۔

اس افسانے ”رقص مقابر“ میں دکھایا گیا ہے کہ کیسے پڑھے لکھے لوگ افغانستان پر امریکی حملے کے بعد بھاگ نکلے اور پاکستان میں پناہ گزین ہو کر یہاں کی زمین کا پیوند ہو گئے ۹/۱۱ کے بعد کی صورتحال کی بھرپور عکاسی اس افسانے میں ملتی ہے۔ اکیسویں صدی کی شروعات افغانستان پر ایک ناگہانی مصیبت کے ورود سے ہوئی۔ بغداد کے بعد امریکہ نے افغانستان پر جس طرح سے بموں کی بارش کی۔ اس کی وجہ سے لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے اور ہزاروں افراد لقمہ اجل بن گئے۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کو ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنی پڑی۔ محض اس لیے کہ ایک منہ زور طاقت کو کوئی بھی لگام ڈالنے والا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس افسانے میں طالبان کے دور میں خواتین کی تعلیم پر پابندی اور ان کو گھروں میں ان کو پابند رکھے جانے کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے ”رقص مقابر“ میں افغانستان کے سیاسی حالات پر اس طرح سے روشنی ڈالی ہے۔

لوگ بھاگ رہے تھے، گرتے پڑتے ٹھوکریں کھاتے، گردنوں میں دربدری کے طوق لٹکے ہوئے، آنکھوں میں ویرانی و اور وحشتوں کے الاؤ جلتے ہوئے، شہراور دیہات، کھیت اور باغات سرنگوں سے اٹے ہوئے، پٹے ہوئے۔ ہماری عظیم طاقتوں کی ایجادوں سے پناہ کہیں نہیں۔ بچے باپ سے محروم، ماؤں سے بچھڑے ہوئے۔ کسی کا ہاتھ ندارد۔ کسی کی ٹانگیں اڑی ہوئی۔ میری نگاہوں میں اندرا گاندھی آف چائلڈ ہیلتھ کا بل وارڈ گھوم جاتے ہیں جہاں میں نے سیکڑوں معذور بچوں کو دیکھا تھا جو لینڈ مائنز اور راکٹوں کا شکار ہوئے۔ سوراخ دار ہڈیاں،

کھوپڑیاں چٹنی ہوئی۔ کسی کے دونوں ہاتھ پیر کٹے ہوئے۔ یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے۔ چار برس سے ادھر اور ادھر دونوں طرف دعویٰ نفاذ اسلام کا۔ دونوں اپنے مقتولین کو شہید کہنے پر مصر، ایک دوسرے کے مقتولین کو جہنم واصل کرنے کی لذت سے سرشار۔ قاتل بھی کلمہ گو مقتول بھی۔ دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی... اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگِ مسلمانی؟^(۶)

اس طرح افسانہ نگار نے افغانستان میں طالبان کے مختلف فنکشنز اور گروہوں کے درمیان جاری جنگوں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ افسانہ نگار نے بڑی مہارت کے ساتھ افغانستان کے سیاسی اور سماجی حالات کو پیش کیا ہے۔ کچھ اسی قبیل کا زاہدہ حنا کا ایک اور افسانہ ”جاگے ہیں خواب“ ہے جس میں عراق کی سیاسی و سماجی صورتحال کو واضح کیا گیا ہے۔ عراق میں امریکی بربریت اور وحشت و دہشت کے خونچکاں مناظر کو دیکھ کر اس کہانی کی مرکزی کردار لالہ دانیال دلی پہنچ کر بھی امن و سکون کی زندگی بسر نہیں کر پاتی۔ ایک حساس انسان جس نے جنگ کی ہولناکیوں کو بذاتِ خود دیکھا ہو اور ہزاروں لوگوں کو بے دردی سے قتل کیے جاتے دیکھا ہو، وہ بھلا کس طرح سے اپنے اعصاب پر قابو رکھ سکتا ہے۔ عراق پر امریکیوں کی بربریت اور عراق کی تباہی کے مناظر خواب میں دیکھ کر لالہ ڈر کے اٹھ بیٹھتی ہے۔ وہ عورتوں کی بے حرمتی اور عصمت دری کرتے ہوئے امریکی لوگوں کو دیکھتی ہے۔ ان جنگی جرائم کو خواب میں دیکھ کر اس کی نیند میں خلل واقع ہوتا ہے اور وہ سکون کی نیند نہیں لے سکتی۔ مزید یہ کہ لالہ دانیال کو تاریخی حوالے سے عراق اور دہلی دونوں لہو میں رنگ ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ان کے اندر لہو بہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اسے ماضی میں انگریزوں کے ہاتھوں دلی کی غارت گری بھی یاد آ جاتی ہے جسے تاریخ میں اس نے پڑھا ہے۔ نتیجتاً وہ کسی ہذیان کی کیفیت میں چلی جاتی ہے۔ اس افسانے کے ذریعے سے زاہدہ حنا نے عراق کے جنگی، سیاسی و سماجی حالات کو بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ عصری شعور کے اعتبار سے زاہدہ حنا کے افسانے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

زاہدہ حنا کا ایک اور افسانہ ”تنہائی کا چاہ بابل“ کچھ اسی قسم کی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے جو نائن الیون کے بعد عرب اور ایشیائی نژاد لوگوں کو پیش آئی تھی۔ نائن الیون کے بعد عرب اور ایشیا کے لوگوں کو شک کی بنا پر گھیر لیا جاتا ہے اور انھیں دہشت گرد کہہ کر مار دیا جاتا ہے۔ اس طرح سمیر جو یہودی ہے اور اس فسانے میں ایک محرک کردار کی حیثیت رکھتا ہے، وہ بہت سی زبانیں جانتا ہے۔ لیکن اسے شک و شبہ کی بنا پر قید خانے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر اگر زاہدہ حنا کے افسانوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ زاہدہ حنا

برصغیر پاک و ہند کے مشترکہ گنگا جمنی کلچر کی بے باک نسوانی آواز ہے اور تاریخ سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رگوں میں تاریخ بہ رہی ہے اور وہ اپنے معاصر سیاسی اور سماجی منظر نامہ کو تاریخی بیانیے کے اسلوب میں بیان کرتی ہیں۔ مذہبی بنیادوں پر تقسیم اور لسانی بنیادوں پر تقسیم سے اسے سخت نفرت ہے۔ اس طرح اس کے افسانے ہر جگہ کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ جہاں بھی سرکاری سطح پر یا فوجی سطح پر دہشت گردی یا پر ظلم و جبر ہوتا ہے تو زاہدہ حنا کا قلم اس ظلم و جبر کے خلاف متحرک ہو جاتا ہے۔ ان کے ہاں سیکڑوں ایسے کردار ہیں جو سیاسی و سماجی آشوب کی بہتر نمائندگی کرتے ہیں۔

حواشی

- ۱۔ ڈاکٹر انوار احمد، ”اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ“، (ملتان: کتاب نگر، ۲۰۱۷ء)، ص ۶۶۸
- ۲۔ زاہدہ حنا، ”زیتون کی ایک شاخ“، مشمولہ ”تتلیاں ڈھونڈنے والی“، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۲۳
- ۳۔ ایضاً، ص ۳۶
- ۴۔ زاہدہ حنا، ”قصہ بسمل ہے“، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۴۵
- ۵۔ ایضاً، ص ۶۵
- ۶۔ ایضاً، ص ۸۸

مآخذ

- ۱۔ احمد، انوار، ڈاکٹر، ”اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ“، (ملتان: کتاب نگر، ۲۰۱۷ء)، ص ۶۶۸
- ۲۔ حنا، زاہدہ، ”زیتون کی ایک شاخ“، مشمولہ ”تتلیاں ڈھونڈنے والی“، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۲۳
- ۳۔ _____، ”قصہ بسمل ہے“، (لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء)، ص ۴۵

